جلد01شمارہ 2024،17

Article

Intellectual Diversities of Professor Khalil Siddiqui's Poetry

پروفیسر خلیل صدیقی کے کلام کی فکری تنوعات

Dr. Saima Abbas, [1] **Dr. Shahida Rasool**[2]

[1] EST (Urdu), Govt. M.C Boys School, Multan

[2] Assistant Professor, The Women University, Multan

*Correspondence: saimaabbas553@gmail.com

ڈاکٹر صائمہ عباس[1] ڈاکٹر شاہدہ رسول[2]

[1]EST(اُردو)، گورنمنٹ ایم سی بوائز سکول، ملتان، [2] اسسٹنٹ پروفیسر، دی ویمن یونیورسٹی، ملتان

eISSN: 2073-3674
pISSN: 1991-7813
Received:15-04-2024
Accepted:19-06-2024
Online:27-06-2024

Copyright: © 2023 by the authors. This is an access-open article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract: Khalil Siddiqui is a renowned linguist, critic, and poet. His linguistic prowess has been recognized at national as well as international level. As a Urdu Language literary luminary and critic he has proved his mettle in the prestigious literary circles. Despite his literary genius his self-effacing nature has prevented him from exposing himself through his poetic publications. That is the main reason why he could not showcase his prodigious talent in the shape of published works. This article therefore is an humble attempt to introduce the literary world to his creative genius and sublime poetry, In the shape of a compendium of his un published poetry and several poetic nuggets earlier published in different magazines and newspapers. In this publication an attempt has been made to throw fresh vignettes on Khalil Siddiqui's poems and Ghazals highlighting the rich diversity of subjects covered in his poetry. The critical commentary on his works would enable the literary aficionados to understand his rich contribution to the development of a new tradition in Urdu Ghazal besides throwing light on the reasons why his creative contribution remained covered in a mist of obscurity.

Keywords Linguist, Critic, Sublime, Poet, Creative, Prevented, Literary, Exposing, Prestigious, Obscurity, commentary

خلیل صدیقی ایک نامور ماہر لسانیات، نقاد اور شاعر ہیں۔ لسانیات پر ان کی مہارت کا اعتراف قومی اور بین الاقوامی سطح پر کیا گیا ہے۔ بحیثیت نقاد بھی انہوں نے اپنی علمی وادبی شخصیت سے اردو دنیا کو متاثر کیا، مگر خلیل صدیقی اپنے تخلیقی وصف یعنی شاعری منظر عام پر لانے سے احتراز برتتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام کسی شعری مجموعے کی صورت میں سامنے نہیں آ سکا۔ اس مقالے میں ہم نے مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہونے والے پروفیسر خلیل صدیقی کے شعری سرمائے کے ساتھ ساتھ ان کے غیر مطبوعہ کلام سے اردو دنیا کو متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس مساعی میں ہم اس امر کا جائزہ لیں گے کہ پروفیسر خلیل صدیقی کی غزل اور نظم کن موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمارے پیش نظر یہ بھی رہے گا کہ انہوں نے روایتی مضامین باندھے ہیں یا جدید موضوعات سے غزل کی وسعت میں اضافہ کیا ہے۔ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ ان کا کلام اب تک تاریخی مغالطے کا شکار کیوں ہے۔

ادبی دنیا اپنے دامن میں بہت سے ایسے مصنفین کو سموئے ہوئے ہے کہ جن کے علم و فضل سے نہ صرف ادب کے خزانوں میں گراں قدر اضافے ہوئے بلکہ وہ پڑھنے والوں کے ذہنوں میں اپنی تخلیقات کے ذریعے ان مٹ نقوش بھی چھوڑ گئے۔

پروفیسر خلیل صدیقی کا شمار بھی ایسے ہی لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ ان کی علمی شخصیت کے کئی حوالے ہیں اور ان کی متنوع تحقیقی جہات پر اکثر و بیشتر بات بھی ہوتی رہتی ہے۔ حال ہی میں راقمہ نے ان کی ادبی و لسانی خدمات کے موضوع پر پی ای ڈی کا مقالہ بھی تحریر کیا ہے۔ جس میں بڑے تفصیلی انداز میں ان کے بہترین معلم، نامور ماہر لسانیات اور نقاد و شاعر ہونے کے حوالے سے تحقیق کی گئی ہے۔ ہمارے لیے یہ باعث مسرت ہے کہ ان کی تخلیقی شخصیت کے ایک نہاں گوشے کو اس تحقیقی مقالے میں سامنے لایا جارہا ہے۔ جس سے ادبی حلقوں میں واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ ہماری منفرد تخلیقی دریافت بھی ہے۔ اس کے اسباب و حرکات کو اجاگر کرنے کا موقع نہیں تاہم یہ وضاحت ضرور ہے کہ خلیل صدیقی کے اہل خانہ سے ان کی ذاتی بیاض ملی جس سے ان کی شعری کائنات کی دریافت ہوئی اور پھر مختلف ادبی رسائل میں ان کی مطبوعہ شاعری کا کھوج لگا کر ان کی شاعرانہ جہان فکر کی وسعتوں کا اندازہ لگانے کی سعی کی گئی ہے۔

اس تحقیقی مقالے میں اس امر کا جائزہ لینا مقصود ہے کہ ایک پختہ کار شاعر ہونے کے باوجود انھوں نے شاعری کی طباعت کی طرف توجہ کیوں نہ دی اور ان کی وفات کے بعد بھی اب تک ان کے شعری سرمائے کو منظر عام پر لانے کے لیے کیوں تساہل پسندی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے۔ بالخصوص یہ دیکھنے کی کوشش بھی کی جائے گی کہ ان کی شاعری میں کونسی ایسی چیزیں ہیں جو انہیں ایک پختہ کار شاعر کے درجے پر فائز کرتی ہیں۔

دنیائے ادب میں پروفیسر خلیل صدیقی بطور ماہر لسانیات کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ لسانی موضوعات پر آپ کی تحریر کردہ کتب اور متعدد لسانی مقالہ جات ماہر لسانیات کے طور پر آپ کی شناخت کرانے کے لیے کافی ہیں لیکن اس کے علاوہ ایک اور تخلیقی جوہر بھی آپ کو قدرت کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا جس سے صرف افراد خانہ، دوست احباب اور ملنے جلنے والے واقف تھے یہ جوہر آپ کی شاعری ہے۔

پروفیسر خلیل صدیقی نے شاعری کا آغاز زمانہ طالب علمی سے ہی کر دیا تھا کالج کی ادبی محفلوں میں آپ خاص طور پر شرکت کیا کرتے تھے۔ 1940ء میں خلیل صدیقی بی۔اے کے آخری سال میں تھے اور ناصر علی عباسی ہتھ کارنی سٹی کالج کے اردو، فارسی کے استاد تھے۔ آپ اپنے استاد کی شخصیت سے بہت متاثر تھے اور ان کی راہنمائی میں کالج کی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتے تھے اسی دوران ان کا انتقال ہوا تو کالج میگزین کے اردو حصے کو آپ نے اپنے استاد کے نام سے منسوب کیا اور اس کے خصوصی ایڈیشن کے لیے مرثیوں اور نظموں کی ضرورت محسوس کی بقول سیما صدیقی:

> "پہلے تو خلیل صدیقی کو شاعروں کے در کے چکر لگانے پڑے پھر جو نظمیں ملیں وہ استاد
> سے محبت اور ان کے مقام کی وجہ سے ان کی نظروں میں نہ جچیں چونکہ یہ حسب مرضی

نہ تھیں اس لیے خلیل صدیقی نے خود نظمیں لکھنے کا ارادہ کیا اور یوں انہوں نے 1940ء میں پہلی مرتبہ شعر کہے۔"[1]

قیام پاکستان سے پہلے مشاعروں کا بہت رواج تھا اور پروفیسر خلیل صدیقی ان میں باقاعدہ شرکت کرتے تھے پاکستان بننے کے بعد آپ ہجرت کر کے کراچی آ گئے اور شاعری صرف بیاض تک محدود ہو گئی دریں اثنا آپ کا وہ کلام جو قیام پاکستان سے پہلے آپ نے مشاعروں میں شرکت کے دوران پڑھا اس میں سے بہت کم محفوظ رہا پاکستان آنے کے بعد آہستہ آہستہ آپ کی دلچسپی شاعری کی طرف کم اور لسانیات کی طرف بڑھنے لگی اور آپ نے مکمل طور پر خود کو لسانی موضوعات کی طرف متوجہ کر لیا یہی وجہ ہے کہ آپ کی زندگی میں آپ کا بہت کم کلام شائع ہوا۔ چونکہ آپ شاعری کسی کے سامنے لانے کی خواہش نہ رکھتے تھے لہٰذا آج بھی آپ کے اہل خانہ بیاض کو زیور طباعت سے آراستہ کرنے سے احتراز برتتے ہیں آپ کی جتنی بھی شاعری چھپی اس میں احباب کا بے حد اصرار کارفرما رہا ہے ڈاکٹر انوار احمد رقمطراز ہیں:

"بات یہ ہوئی کہ ایک روز صدیقی صاحب بر سبیل تذکرہ آتش کی جوانی کو یاد کرتے ہوئے اعتراف کر بیٹھے کہ وہ شعر بھی کہا کرتے تھے بس پھر کیا تھا۔ "اللہ دے بندہ لے" ہم ان کے پیچھے پڑ گئے۔ ہر موقع اور ہر ملاقات میں ان سے نخلستان کے لیے تقاضا کرتے تھے مگر وہ طرح دے جاتے ہم نے ان کی منتیں کیں اور پھر روٹھنے کی بھی کوششیں کر دیکھی بالآخر انہیں ستیہ گری کی دھمکی دی جس پر خفا ہو کر انہوں نے اپنی بیاض (کہ جس پر گرد ایام کی کئی تہیں تھیں) ہمیں دکھا دی اور ہم نے موقع ملتے ہی دو تین نظمیں اڑا لیں۔"[2]

پروفیسر خلیل صدیقی کی شاعری دو صورتوں میں سامنے آتی ہے۔

مطبوعہ کلام

غیر مطبوعہ کلام

آپ کا غیر مطبوعہ کلام ایک ذاتی ڈائری میں ہے جو آپ کے اہل خانہ کے پاس اب بھی موجود ہے۔ اسی کلام کا کچھ حصہ آپ کی زندگی میں مختلف ادبی رسائل میں شائع ہوا اور چند نظمیں اور غزلیات وفات کے بعد سامنے آئیں۔ آپ کی زندگی میں شائع ہونے والے کلام میں 1968ء میں "نخلستان" رسالے میں تین نظمیں "دعائے نیم شبی"، "آج کی رات" اور "نگارِ شب کو روک

لو" شامل ہیں۔ 1973ء میں تجربہ کے عنوان سے ایک اور نظم بھی "نخلستان" میں شائع ہوئی یہی نظم بعد ازاں "آشوبِ تجربہ" کے زیرِ عنوان "قلم قبیلہ "میں 1981ء میں چھپی۔

پروفیسر خلیل صدیقی کی وفات کے بعد مارچ 2003ء کے "انگارے پروفیسر خلیل صدیقی نمبر" میں آپ کی تین غزلیں اور سات نظمیں شائع ہوئیں۔ 2008ء میں ڈاکٹر نعمت الحق نے آپ کی یادوں پر مشتمل ایک کتاب "پیکرِ مہر ووفا" کے نام سے مرتب کی تو اس میں آپ کی شاعری کو بھی شامل کیا۔ اس کتاب میں 4 غزلیں اور آٹھ نظمیں ہیں الجھنیں، نگارِ شب کو روک لو، ایک تعزیر نو، جشنِ آزادی کے عنوان سے موجود نظمیں اس سے پہلے انگارے خصوصی نمبر میں بھی شامل کی جاچکی تھیں، "پیکر مہر ووفا" میں ایک گیت بھی شامل کیا گیا ہے۔

"گورنمنٹ کالج کوئٹہ تاریخ کے آئینے میں " ڈاکٹر انعام الحق کوثر کی کتاب 2019ء میں سامنے آئی تو اس میں بھی پروفیسر خلیل صدیقی کا تعارف اور شاعری موجود تھی۔ اس کتاب میں شامل ایک غزل اور نظم "اعتراف "انگارے خلیل صدیقی نمبر سے حاصل کی گئی اور "زہر خند" کے عنوان سے نظم نخلستان میں "دعائے نیم شبی" کے زیر عنوان شائع ہو چکی تھی نظم "اقبال" اس کتاب میں موجود ہے جو اس سے پہلے کسی رسالے میں شائع نہیں ہوئی اور یہ نظم پروفیسر خلیل صدیقی کی بیاض کا حصہ ہے۔

پروفیسر خلیل صدیقی کی شاعری کی جب بات آتی ہے تو یہ شاعری کسی لحاظ سے بھی کم مرتبہ نہیں غزلیات میں خلیل بطور تخلص استعمال کیا گیا ہے۔

میرا بھی ہاتھ ہے آرائش جہاں میں خلیل
زمانہ کس لیے کرتا ہے پائمال مجھے[3]

غزلیات کے موضوعات میں سب سے اہم موضوع محبت و دلی کیفیات و جذبات کے بیان کے حوالے سے ہے آپ کی غزلیہ شاعری حسن و محبت کے مضامین بیان کرتی نظر آتی ہیں۔ آپ کے ہاں محبت ایک پاکیزہ جذبے کے طور پر ابھرتی ہے اور محبت میں صلے کے طلبگار ہیں نہ ہی وفاداری کی کوئی قیمت مقرر کرتے ہیں۔

ہمیں تو پھول کے بدلے ملے گا داغ جگر
یہ سوچ کر بھی بہاریں لٹائے جاتے ہیں[4]

محبت ان کے مطابق صرف ایک جذبہ یا احساس ہی نہیں بلکہ مسلسل آزمائش اور کرب کا نام ہے جو عاشق کو سہانے خوابوں میں گم رہنے کی بجائے درد کا پیغام سناتی ہے۔

عشق کا حاصل کربِ مسلسل

دیدہ و دل میں شعلہ و شبنم[5]

آپ کی غزلیات میں ایک پہلو ہجر، جدائی اور آنسوؤں کے حوالے سے ہے۔ دل ٹوٹنے کی صدا ان اشعار میں جا بجا سنائی دیتی ہے اور دل کی ناتمام آرزوئیں درد کو مزید بڑھاتی ہیں اور وہ درد آنسوؤں میں ڈھلتا ہے جس کے اظہار کے لیے شاعری ایک ذریعہ بنتی ہے۔

ابھر ہی آتے ہیں زخمِ جگر کبھی نہ کبھی

نکل ہی جاتے ہیں آنسو تمہارے نام کے ساتھ[6]

آپ کی غزلیات میں غنائیت کا عنصر ہے جو شاعری کی تاثیر بڑھا کر موسیقیت پیدا کرتا ہے آپ کی شاعری عزم و حوصلے کا درس دیتی ہے اور ہر قسم کے حالات میں سینہ سپر ہونے کا سبق ملتا ہے۔

فصلِ گل چھوٹ گئی تو کیا غم ہے

فصلِ گل ہی تو کائنات نہیں[7]

پروفیسر خلیل صدیقی کی غزلیات داخلی کیفیات کو بیان کرتی ہیں۔ آپ کے کلام میں سوز و گداز ہے غمِ جاناں کلام کو ایک نئی معنویت عطا کرتا ہے یہی پھر غمِ دوراں میں ڈھل کر داخلی کیفیات کو آفاقی تناظر کی صورت عطا کرتا ہے۔ بیگانگی اور وجود کے لا ینحل مسائل نے پوری دنیا کے انسانوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ پروفیسر خلیل صدیقی ایک صاحبِ فکر کی حیثیت سے انسان کے احساسات کا ادراک کر کے اسے شاعری کا روپ دیتے ہیں جو علاقے، عہد اور ذاتیات سے بالاتر ہو کر دورِ جدید کے ہر فرد کا المیہ بنتا دکھائی دیتا ہے۔

دنیا سے پھر شکایت بیگانگی غلط

جب ایک دل کو دوسرے دل کی خبر نہیں[8]

آپ کی شاعری میں ایک کثیر تعداد نظموں کی ہے یہ نظمیں آزاد اور پابند دووں ہیئتوں میں ہیں۔ آپ کچھ عرصہ ترقی پسند مصنفین کے حلقے سے وابستہ بھی رہے اس لیے شاعری خصوصاً نظمیں حقیقت نگاری کا عنصر رکھتی ہیں۔

موضوعی جائزہ لیا جائے تو ان نظموں میں تنوع ملتا ہے۔ آزادی سے پہلے کی نظمیں لب و لہجہ اور اندازِ بیاں کے حوالے سے انفرادیت کی حامل ہیں چونکہ یہ ایسے دور میں تحریر کی گئیں جب ہر طرف آزادی، انقلاب اور یکجہتی کے نعرے بلند تھے لہٰذا

بیشتر نظمیں تحریک آزادی اور قیامِ پاکستان کے بعد کی صورتحال واضح کرتی ہیں "جشن آزادی" اس دور کی نمائندہ نظم ہے اس کا بنیادی موضوع آزاد مملکت اور اس سے وابستہ خوابوں کا بکھرنا ہے۔

میرے گم نام رفیقو یہ چراغاں کی بہار

راہ کا ایک شگوفہ سہی، منزل تو نہیں

گردِ ناقہ ہی سہی، لیلیٰ محمل تو نہیں

زیب دیتا نہیں اس وقت یہ راہوں کا سنگار

شبنم و موج صبا بن کے در آنا ہے ہمیں

کتنے پامال سے غنچوں کو کھلانا ہے ہمیں

زیست کے کتنے جذاموں کو مٹانا ہے ابھی

کتنے بے نور چراغوں کو جلانا ہے ابھی[9]

آزادی حاصل کرنے کے بعد ایک خود مختار اور آزاد مملکت کے بارے میں جو خواب تھے وہ حقیقت کی بجائے جب سراب بنتے دکھائی دیئے تو اس کا اظہار پروفیسر خلیل صدیقی نے نظم "سراب" میں کچھ اس انداز سے کیا۔

ایک سہانے خواب کی تعبیر اب بتلائیں کیا

کتنے ماہ پارے فرسودہ ہو کے آخر سو گئے

کس سے کہیے نور کو تاریکیوں نے کھالیا

کتنے سورج آکر اس ظلمات میں گم ہو گئے

اب مہذب رہزنی کا کیجئے کس سے گلہ

کتنے خضرِ راہ اس منزل پہ آکر کھو گئے[10]

پروفیسر خلیل صدیقی کے کلام میں ابدی سچائیوں کو بے نقاب کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہے چھوٹی سی نظم "سچ" میں انہوں ے قبل مسیح تاریخ سے دورِ حاضر کی المناک صورتحال کو نہایت خوش اسلوبی سے الفاظ کے قالب میں ڈھالا ہے وہ سچائی کے پرچارک ہیں مگر کبر وریا کی اس دنیا میں سچ کا منصب اوڑھ کر جینے والوں کے انجام سے بھی بے خبر نہیں۔

تم بھی سچ کہتے ہو یارو

سچ زندہ تھا

سچ زندہ ہے
کل بھی سچ زندہ رہے گا
لیکن یارو
سچ پوچھو تو ہم لوگوں نے
سچ کو زندہ کر رکھا ہے
دو حرفی پیکر میں جکڑ کر
جب بھی سچ انگڑائی لے کر
اس پیکر سے باہر نکلا
آب و گل کے روپ میں آیا
ہم نے اس کو زہر دیا
مصلوب کیا یا سولی دی۔[11]

پروفیسر خلیل صدیقی کی نظموں میں عصری شعور کے علاوہ مناظر فطرت کے حسن و خوبصورتی کے بیان کا موضوع بھی بہت نمایاں ہے "ساون" نظم ان کے فطرت سے لگاؤ کو سامنے لاتی ہے۔اسی طرح "نگار شب کو روک لو" نظم فطرت کے حسن کے بیان اور رومانوی انداز بیان کی حامل ہے رات کے وقت کوئٹہ جیسے سرد علاقے میں چہل قدمی کے دوران برفیلی چوٹیوں کے حسن سے متاثر ہو کر تحریر کی گئی یہ نظم ایک انوکھا تاثر پیدا کرتی ہے۔

رسیلی چاندنی سے دھل گئی فضائے کوہسار
لطیف و سرد دودھ میں گھلا ہے نیل عرش کا
ملی ہے سنگ راز کو پہلی برف کی قبا
خنک سی رس بھری ضیا مہین نرم سی ردا[12]

رات ہی کے استعارے کو استعمال کرتے ہوئے لکھی گئی نظم "آج کی رات" میں ندرت خیال اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے شاعرانہ مصوری نے رات کی ایک نہایت رنگین تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔رات کو احساس وادراک کی جس کیفیت کا اشارہ بنایا گیا ہے اس نے داخل اور خارج کو ہم آہنگ کر دیا ہے۔ کیف گیتی کیفیت زائی بن گیا ہے کلی کا چٹکنا، مہتاب کی بجائے آفتاب کا مرہون منت ہے لیکن رات مستی میں یوں گنگنا اٹھی ہے کہ کلی اس کی رعنائی سے متاثر ہو گئی ہے۔

ایک گلشن کلی کے دامن میں
ایک جنت سوادِ گلشن میں
ملتے جاتے ہیں پے بہ پے کتنے
نو بہ نو لذتوں کے گنجینے
موج در موج اہتزازِ رواں
سیل در سیل ابتہاج دواں[13]

نظم "فغانِ نیم شبی" جو بعد ازاں "زہر خند" کے زیر عنوان شائع ہوئی اس نظم کے ایک ہونے کے باوجود عنوانات کا اختلاف نظم کے تاثر پر گہرا اثر مرتب کرتا ہے "فغان نیم شبی" کا عنوان خدا اور بندے کی قربت کی جانب اشارہ ہے۔ نیم شب میں بلند کی جانے وای فریاد مظہر ہے کہ خدا سے مخاطب ہونے والا اس کے صاحب قدرت ہوے کا معترف بھی ہے اور اپنے اخلاص کا ضامن بھی۔ تعلق کی گواہی ذہن میں ابھرنے والے وہ سوالات دے رہے ہیں جو اپنی جگہ شکوہ بھی ہیں اور طلب بھی شکوے سے طلب تک کا یہ سفر ترقی پسندانہ خیالات کا حامل ہے فغان نیم شبی کے زیر عنوان بندہ کہتا ہے۔

"میرے آقا، مجھے اپنی محرومیوں کی شکایت نہیں
اپنے اخلاص کی ذلتوں کا گلہ بھی نہیں
میں بس تجھ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں
مدت میں حرماں نصیبی کو جو ٹھنڈی چھاوں ملی تھی
جہاں میری درماندگی نے ابھی دم لیا تھا
وہی مہر و اخلاص کی ٹھنڈی چھاوں
میرے ذہن کو کس لیے ڈس رہی ہے "[14]

سوال یہاں ختم نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسے موڑ پر پہنچتا ہے جہاں خالق کی قوت تخلیق پر سوالیہ نشان اٹھتا ہے شکوہ کرنے والا اپنی ناکامیوں، حسرتوں اور تکلیفوں کو اپنی ذات سے جدا کر کے دیکھتا ہے اور تخلیق کے پلڑے میں تول کر جب اسے اپنی حسرتیں اور ناکامیاں اپنے وجود سے بھاری دکھائی دیتی ہیں تو ایک زہر خند اس کے لبوں پر نمودار ہوتا ہے اور کن فیکون کے سربستہ رازوں پر ایک رازآشنا کی سی نظر ڈال کر کہتا ہے۔

کیا یہی زندگی ہے جس کے لیے

میری تخلیق کرنی پڑی تھی تجھے
حسرت و تلخ کامی ہو جس کی سرشت
ایسی ہستی کی تخلیق سے فائدہ[15]

نظم "تجربہ" بعد ازاں "آشوب تجربہ" کے عنوان سے بھی شائع ہوئی یہ نظم بھی انسان کی زندگی میں موجود ناکامیوں کے بیان کے حوالے سے ہے جس میں انسانی زندگی کو ایک تجربے سے تشبیہ دے کر ناکام حسرتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

ابن آدم کی تقدیر ایک تجربہ
وسوسوں کا، تذبذب کا، بحران کا
خوف کی بے یقینی کی تاریکیاں
ابن آدم کی تقدیر بنتی رہی
تلخیاں، حرمتیں، نت نئی کلفتیں
بے نشان راہ سے خار چنتی رہیں[16]

نظم "اعتراف" تغزل کے اثر میں بھیگی ہوئی ہے یہ خلیل صدیقی کی بیاض میں آخری نظم بھی ہے۔ اس کا موضوع انسان کی قوت اختراع ہے۔ انسان جو خالی ہاتھ اس بے آب و گیاہ دنیا میں آیا تھا اس نے ایک طرف دنیا بسائی اور دوسری طرف اپنے تخیل کو بھی آباد کیا یہ بے کنار تخیل ہی تھا جس نے اس کی حقیقی دنیا پر حکومت کی ذروں کو خورشید بنانا ہو یا سنگ ریزوں کو لعل و گوہر کا ہم سر کرنا، قطرے میں سمندر دیکھنا ہو یا حسن سادہ کو پر کار بنانا انسانی تخیل کی رعنائی کا مرہونِ منت ہے یہ نظم انسانی عظمت انسان کے قوتِ تخیل کا ایک اعتراف ہے۔

ہم نشیں میری طبیعت کے تلون پر نہ جا
یہ تنوع ہی تو ہے مایۂ ہستی میرا
ہر قدم وادیٔ ایمن میں تصور کر کے
میں نے ہر لمحہ نئے طور کی خواہش کی ہے
بارہا خرمن دل آپ ہی زد میں لا کر
میں نے ہر برقِ تجلی کی پرستش کی ہے

مجھ سے اعجاز مرے حسن و نظر کامت پوچھ
مجھ سے انداز میری شام و سحر کامت پوچھ
میں نے ذروں کو بھی خورشید بنایا اکثر
سنگ ریزوں کو کیا لعل و گوہر کا ہم سر[17]

ان تصریحات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ خلیل صدیقی کی شاعری متنوع موضوعات کی حامل ہے جہاں انہوں نے روایت کی پاسداری کرتے ہوئے غزل اور نظم میں ایسے موضوعات کو جگہ دی جن کا موضوع غزل اور نظم کا روایتی دکھ ہے وہاں بحیثیت نظم گو سماجی حقائق کے نباض بھی ہیں ان کی شاعری میں جگہ جگہ اشارے موجود ہیں جو معاشرے میں پھیلے دکھ، قرب اور اذیتوں کی بے لاگ ترجمانی کرتے ہیں۔

اس مختصر مقالے میں ہم نے زیادہ تر ان کی مطبوعہ شاعری کے حوالے درج کیے ہیں۔ واضح رہے کہ ان کا کلام اب تک کسی باقاعدہ شعری مجموعے کی صورت میں منظر عام پر نہیں آیا ان کی مطبوعات مختلف رسائل اور جرائد میں شامل ہیں یہاں غیر مطبوعہ کلام کے بھی کچھ حوالے اخذ کئے گئے ہیں تا کہ ادب کے قارئین کو بتایا جاسکے کہ ایک بہت بڑا شاعر تاریخی مغالطے کی نظر ہوا۔ یہ مقالہ خلیل صدیقی کے شعری افق کی تفہیم میں اردو دنیا کی معاونت کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے۔

حوالہ جات

1۔ سیما صدیقی، خلیل صدیقی شخصیت و فن، غیر مطبوعہ مقالہ (مملوکہ ملتان: بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، 1987)، ص15۔
2۔ انوار احمد، ڈاکٹر، "خلیل صدیقی" مشمولہ، نخلستان، (ملتان: گورنمنٹ بوسن روڈ کالج، 1968)، ص87۔
3۔ خلیل صدیقی، غیر مطبوعہ بیاض، عکسی نقل، (مملوکہ: راقم الحروف)، ص28۔
4۔ ایضاً، ص24۔
5۔ خلیل صدیقی، "غزل"، مشمولہ، انگارے خلیل صدیقی نمبر، (ملتان: حافظ پٹنگ پریس، 2003)، ص88۔
6۔ خلیل صدیقی، غیر مطبوعہ بیاض، ص148۔
7۔ ایضاً، ص156۔
8۔ ایضاً، ص17۔
9۔ نعمت الحق، ڈاکٹر، پیکر مہر و وفا (کوئٹہ: قلات پبلشرز، 2008)، ص244۔

10۔ خلیل صدیقی، "نظم سراب"، مشمولہ، انگارے خلیل صدیقی نمبر، ص91۔

11۔ ایضاً، ص93۔

12۔ نعمت الحق، ڈاکٹر، پیکرِ مہر و وفا، ص247۔

13۔ خلیل صدیقی، نظم آج کی رات، مشمولہ، نخلستان، ص87۔

14۔ انعام الحق کوثر، ڈاکٹر، گورنمنٹ کالج کوئٹہ تاریخ کے آئینے میں (کوئٹہ: ادارہ تصنیف و تحقیق بلوچستان 2019)، ص 301۔

15۔ ایضاً، ص302۔

16۔ خلیل صدیقی، نظم آشوبِ تجربہ، مشمولہ، قلم قبیلہ (کوئٹہ: ادبی ٹرسٹ، 1981)، ص226۔

17۔ خلیل صدیقی، نظم اعتراف، مشمولہ انگارے خلیل صدیقی نمبر، ص90۔